نسائی شعور: اردو فکشن میں تخلیقی صورت گری

ڈاکٹر رخسانہ بلوچ

اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو،

گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی، فیصل آباد

Abstract

This article, casts a glance of ferminist approach in contemporary era. Feminism, is very much into literary theories urdu fiction is discussed with example of some prominent urdu fiction writters' creavtive works.

دنیا کے ادب پر نظر ڈالی جائے تو سب سے اہم اور اختلافی موضوع عورت ہی ہے جس کو اہلِ دانش نے اپنی عقل سے سلجھانے کی بار ہا کوشش کی جن میں شاعروں کے دیوان، عالموں کی فصاحت، اِہل زبان اور اہلِ نظر کے تصورات نے اس کو اپنی بصیرت اور بصارت سے دیکھنے کی سعی لا حاصل کی مگر ہر دفعہ ریت کی مانند مٹھی سے نکل کر دوبارہ صحرا کا حصہ بن گئی۔ ادب کے سپیروں نے اپنے منتروں سے اس کو قید کرنے کے بے شمار جتن کئے مگر ہمیشہ جوالا مُکھی کی طرح اس نے ان کو جلا کر بھسم کر دیا۔ ادب کے پنڈتوں نے اپنے بھجنوں سے اس کو اپنی گرفت میں لانے کے لیے اپنے حال سے بے حال اور گھر سے بے گھر ہو گئے مگر اس پر گرفت حاصل نہ کر سکے اس کو ہمیشہ ایک نئی دنیا کے سپرد ہی کرنا بہتر خیال کیا۔ اس کی اہمیت کو اُجاگر کرنے کے لیے حمورابی کے کتبے، موسوی الواح، اشوک کی لاٹھ، اجنتا کے غار، بدھا کے اشٹ مارگ، منو کے پنج تنتر، تاؤ کا فلسفہ، زرتشت کی اوستا، کنفیوشس کا نظریہ، مسیح کی گواہی اس کے علاوہ جالینوس فیثا غورث، بطلیموس، اقلیدس، لقمان، سقراط، بقراط، ارسطو، افلاطون، ابنِ سینا، عطار، رومی، رازی کی حکمت کے ساتھ خیام، جامی، سعدی، فرینکلن، ریپوٹن، کولرج، ملٹن، ہیوگو، بائیرن، ہائیپنز، رسکن، والٹئر، سٹینلے، آرتھر مور، ایمرسن، شیکسپیئر، دانتے، تلسی، خسرو، میر، غالب، جوش، فیض جیسے شاعروں کی شاعری نے اس کو ہمیشہ خراجِ تحسین ہی پیش کیا ہے۔ ادب کے ماہر نشانہ بازوں نے تاک تاک کر تیر برسائے اور کبھی کبھی گھات لگا کر حملے بھی کیے بعض اوقات یہ نشانے اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھے اور بعض دفعہ رہ چلتے مسافر بھی ان کی زد میں آ گئے جن کی بدولت ان کے جسم چھلنی ہو گئے اور وہ رہتی دنیا تک نشانِ عبرت بن گئے۔

انسان اس دھرتی پر ہزاروں سالوں سے موجود ہے اور موجودہ عہد تک آتے آتے اس نے بے شمار جتن

کیے اس کے پیچھے معاشی، سیاسی، ذہنی، اور تہذیبی جدو جہد کی ایک طویل کہانی موجود ہے جس میں پتھر، کانسی اور لوہے کے ادوار کو کسی صورت نہیں بھلایا جا سکتا تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات واضح نظر آتی ہے کہ عورت کا سب سے پہلا تصور ایک دیوی کے روپ میں اُبھرتا ہے، جو کہیں ناہید، زہرہ اور وینس کے روپ میں سامنے آتا ہے انسان چاہے جتنی بھی ترقی کر لے عورت کو قائل کرنے والوں کی منتیں کسی صورت بھی پوری نہیں ہوں گی ازل سے لیکر ابد تک یہ سلسلہ جاری ہے اور رہے گا عورت کے وجود سے اس کائنات میں رنگ موجود ہے اور رہے گا عورت کے بارے میں آج بھی اُن پرانے خیالات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ابنِ حنیف اس بارے میں تحریر کرتے ہیں:

''سات ہزار برس پہلے سومیریوں کے سیلابِ عظیم کی بابلی روایت ہو یا زہرہ و مشتری طوائفوں کا اپنے حسن و صورت سے فرشتوں کا ایمان متزلزل کر کے آسمان پر چلے جانے کی پُر لطف حکائت، مادری تہذیب کی علمبردار زراعت کاروں کا مذہب ہو یا موجودہ عیسائیت اور ہندوازم، عشتار کسی کسی روپ میں ہر جگہ جلوہ گر ہے''۔(۱)

عورت کبھی ماں، بہن، اور بیٹی کے روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے اور کبھی ایک طوائف کی زندگی گزارنے پر اکتفا کرتی ہے عورت کے جذبات اور احساسات کو ہر جگہ سختی سے کچلا جاتا رہا اس نے اپنے حقوق کی جنگ تنہا اور اکیلے لڑی آنے والی ہر آفت کا مقابلہ کیا دنیا کے قدیم مذاہب میں بھی اس کو وہ اہمیت نہ دی گئی جس کی وہ اصل معنوں میں حق دار تھی عورت کا کردار ہر معاشرے میں اہمیت کا حامل ہے اور مختلف خطوں میں مختلف روپ دھارتی رہی مثلاً: مشرق میں عورت مرد کے دامنِ تقدس پر داغ ہے، رومن اسے صرف ایک جنس سمجھتا ہے، یونانی فلسفے نے عورت کو شیطان کہا، توریت نے اسے لعنت ابدی کا مستحق قرار دیا، کلیسا نے اسے بدی کا سرچشمہ قرار دیا اور اسلام دنیا کا وہ واحد مذہب ہے جس نے عورت کو ایسی رفعت عطا کی جس کی مثال دنیا کا کوئی مذہب پیش نہ کر سکا۔ برصغیر میں آریوں کی آمد سے قبل عورت کی سربراہی کا دور تھا جب آریہ سماج نے اس خطے کو اپنی قید میں کیا تو اس نے عورت کو باندی بنانے کا نظام وید کے ذریعے رائج کیا اور اس کو قید و بند کی وادی میں دھکیل دیا گیا اس عہد سے لیکر آج تک عورت کھل کر سانس لینے نہیں دیا گیا البتہ مغلیہ عہد میں اس کو کسی حد تک چین نصیب ہوا اور جلد ہی اس کو دوبارہ اذیت کا سامنا کرنا پڑا۔ عورت نے اپنی اہمیت کو اُجاگر کرنے اور مرد سے تحفظ کی خاطر تنتر اِزم کو فروغ دیا اس کے تحت اگر کوئی مرد یہ خفیہ حروف سیکھے گا تو اس کے لیے مردانہ عضوِ تناسل سے محروم ہونا ضروری تھا تنتر ازم میں عورت مقدس تصور کی جاتی تھی اس میں عورت کے مختلف روپ ہیں جن پر آج بھی کسی نہ کسی صورت یقین کیا جاتا ہے ایک عام ہندو آج بھی ہر وقت خوف زدہ رہتا ہے کہ نہ جانے کب کالی دیوی اس پر غضب ڈھا دے۔ اس کے برعکس مرد نے عورت کے اثر کو زائل کرنے کے لیے دیوتا تخلیق کر لیے اور عورت کے اختیارات کو محدود کر دیا اس کام کے لیے مذہب کو بنیاد بنا کر عورت کے اختیارات کی پامالی کی گئی جس کی بازگشت آج بھی کسی نہ کسی صورت سنائی دیتی ہے ان حالات میں عورت کو ذہنی صلاحیتوں سے محروم کر دیا گیا دنیا کے ہر معاشرے میں عورت کو دوسرے درجے کا شہری قرار

دے کر اس کو جینے کے حق سے بھی محروم کر دیا گیا عورت کی خوبصورتی اور نزاکت سے متاثر ہو کر شعر و ادب میں خصوصی مقام عطا کیا گیا مگر اس کی فطری صلاحیتوں کو نظر انداز کیا گیا اور اس کو آزادیِ اظہار جیسی عظیم نعمت سے مشترکہ طور پر محروم کر کے پسِ پشت ڈال دیا گیا۔ علمِ سیاسیات میں فرد صرف اٹھارھویں صدی میں سامنے آیا اور روسو کا یہ نعرہ کہ:

''انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر جدھر دیکھو وہ پابہ زنجیر ہے۔'' (۲)

یہ انفرادیت کو علمِ سیاست میں داخل کرتا ہے لیکن شخصیت اور اس کے حقوق کا دعویٰ کرنا ایسی جراٗت کا کام تھا کہ روسو بھی صرف نعرہ ہی لگا کر رہ گئے۔ عقد اجتماعی جس کی ابتدا ان الفاظ کے ساتھ ہوتی ہے، بعد میں اسی کو اُلٹا ثابت کرتی ہے۔ انسان کو آزادی تو ضرور دی جاتی ہے لیکن روسو کی ریاست میں انسان کو ایک فرد بننے اور انفرادیت کے سلسلہ میں اپنے حقوق کا ذکر کرنے کا کوئی موقع نہیں دیا جاتا۔ انفرادیت کے قائل وہی لوگ ہو سکتے تھے جن میں اتنا تخیّل نہ ہو کہ وہ اس کے تمام نتائج کا ایک ساتھ خیال کر سکتے ہوں اور جن میں خودی کا جوش اس قدر ہو کہ وہ اِس عالم بے پایاں میں بھی اپنی ہستی کو ایک خاص اہمیت دے سکیں۔ سترھویں صدی کے آخر حصّہ میں دو زبردست انقلاب آئے جن میں ایک امریکہ کا انگریزوں کے خلاف تھا اور دوسرا فرانسیسی انقلاب اِن دونوں میں انسان کے قدرتی حقوق کا بڑے زور وشور سے اعلان کیا گیا۔ اِن دونوں انقلابوں کو اس خیال کے پرچار کا عروج بھی کہا جا سکتا ہے۔ تاریخ سے یہ تو ضرور ثابت ہو سکتا ہے کہ انسان ایک زمانہ میں بالکل وحشی تھا لیکن نہ اس کی زندگی بہت اچھی تھی اور نہ ہی اُن کے کوئی ''حقوق'' تھے۔ ''حق'' کا ذکر اُسی وقت ہو سکتا ہے جب قانون ہو اور قانون صرف ریاست یا سماج بنا سکتا ہے۔ معاہدہ اسی وقت ہو سکتا ہے اور اس کی پابندی پر لوگ مجبور اسی حالت میں کئے جاتے ہیں جب ایک سماج یا ریاست موجود ہو اور اس نے قانون کے ذریعہ اسے لازمی کر دیا ہو اس لیے تاریخ یا منطق سے فطری حقوق ثابت کرنا ناممکن ہے۔ ادب ایک ایسا ذریعہ اظہار ہے جو سوچنے، سمجھنے اور بیان کرنے کی آزادی پر منتج ہے۔ اگر یہ عنصر عنقا ہو تو تحریر محض اخباری رپورٹ یا کسی پارٹی کا منشور یا صرف بیانیہ بن کر رہ جاتی ہے۔ اس لیے جذبہ و ادراک کے اظہار کی آزادی ہی اصل ادب پیدا کرتی ہے۔ ہندو سماج میں عورت نسبتاً زیادہ مسائل کا شکار رہی ہے لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دیا جانا، کم عمری میں شادی، ستی کا رواج اور کسی صوت بیوہ کی دوسری شادی کی اجازت نہ ہونے کی وجہ سے ہندو عورت مرد کا سایہ بن کر رہ گئی تھی ہندوؤں کے زیر اثر رہنے کی وجہ سے مسلمانوں میں بہت سی برائیاں سرائیت کر گئی تھیں اسلام نے عورتوں کو بہت حقوق دیے مگر عورت کی زندگی میں اس کے اثرات کم ہی نظر آتے ہیں۔

اسی پسِ منظر کو بنیاد بنا کر جس میں اجتماعی لاشعور کے اثرات نمایاں صورت میں جلوہ گر دکھائی دیتے ہیں جہاں تک اردو فکشن کا تعلق ہے اس میں عورت کو محض تسکین کے طور پر لیا گیا جس میں اپنی خواہشات کا بدلا عورت کے کردار سے چکانے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ نسائی تمدن کی پوری تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ عورت کا وجود دنیا پر ذلت، شرم اور گناہ کا وجود تھا۔ بیٹی کی پیدائش عیب تصور کی جاتی تھی۔ کئی قوموں میں اس ذلت سے بچنے کے لیے

لڑکیوں کو قتل کرنے کا رواج عام تھا۔ اسلام نے اس کی نفی کی اور عورت کو اس کا جائز مقام دلایا۔ کائنات کی ترقی میں عورت مرد کے شانہ بشانہ کھڑی رہی اور اس نے اپنی خواہشات کو مرد کی خواہشات کے تابع کر دیا اس کے باوجود اس کو چادر اور چار دیواری تک محدود کر دیا گیا اور اس کی تخلیقی صلاحیت کو ہمیشہ کے لیے دفنانے کی بھرپور کوشش کی جاتی رہی ابتدائی اردو شاعری سراپا نگاری سے عبارت تھی جس میں عورت محبوبہ کے روپ میں سامنے آتی ہے اور داستانوں میں اُسے مافوق الفطرت ہستی کے روپ میں پیش کیا یہاں عورت ملکہ تھی یا شہزادی اگر وہ کنیز یا محبوبہ بھی تھی تو اتنی حسین و جمیل کہ مرد اُسے دیکھتے ہی دھڑ ادھڑ اگر کر بے ہوش ہو جاتے رجب علی بیگ سرور ''فسانہ عجائب'' میں شہزادی انجمن آراء کو ان الفاظ میں یاد کرتے ہیں: ''مالِک عفت وعصمت انجمن آراء یہاں کی شہزادی تھی شہرہ جمال بے مثال اس حورِطلعت پری خصال کا از شرق تا غرب اور جنوب سے شمال تک، زبان زدِ خلق حدا تھا اور ایک جہاں حسن کا بیان سن کر نادیدہ اس کا مبتلا تھا۔ آج تک چشم و گوش چرخ کج رفتار نے باایں گردش لیل ونہار ایسی صورت دیکھی نہ سُنی تھی۔ مرقعِ دہر سے وہ تصویر چنی تھی۔ بہت سے شاہ اور شہر یار اس کے وادی طلب میں قدم رکھ کر تھوڑے عرصے میں اوارہ دشت ادبار، پتھروں سر مار مار، مصرع ''رہ روِاقلیم عدم ہو گئے'' قصہ یا کہانی کسی بھی قوم کے شعور اور تخیل کے عکاس ہوتے ہیں۔ اس میں اس قوم کے تخیل کی قوتِ پرواز کا عکس ہوتا ہے اور یہ وہ واحد آئینہ ہے جس سے قوم کی دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔

برصغیر میں اردو ادب کا چلن بہت پرانا ہے ۱۸۵۷ء سے پہلے کا دور داستانوی عہد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جس عہد میں ادب کی سرپرستی درباروں میں ہوا کرتی تھی اور داستانیں بادشاہوں کی فرمائش پر لکھی جاتی تھیں داستانوی ماحول سے لیکر دورِ جدید کے ناول تک عورت کے سارے رنگ موجود ہیں داستانوں میں عشق کی تسخیر کے ایسے مناظر کشید کیے جاتے تھے جن میں لذت کا بھرپور سامان موجود تھا برصغیر میں عورت مرد کے ساتھ آزادی سے نہیں مل سکتی تھی اور مرد نے اس بات کا پھرپور فائدہ اُٹھایا اور عورت سے چن چن کر بدلے لیے اور اس کی آزادی کو مفلوج کر کے رکھ دیا ۱۸۵۷ء کے بعد تخیل کی جگہ حقائق نے لے لی اور سائنس کی ترقی نے ہر ایک کی آنکھیں کھول دیں جس سے زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور ہر ایک نے اپنی آزادی اور حقِ رائے دہی کا برملا اظہار شروع کر دیا۔ اردو ناول کے آغاز کا سہرا لکھنو کے باشندوں کے سر دیکھائی دیتا ہے مولوی نذیر احمد کا تعلق دلی سے تھا اور رتن ناتھ سرشار کا لکھنو سے انہوں نے ناول کی صنف کو متعارف کرایا انہوں نے ناول کو ایک ایسی بصیرت بخشی جس سے آنے والے ناول نگار کسی نہ کسی صورت اب بھی استفادہ کر رہے مولوی نذیر احمد کے ناولوں میں جاگیرداری عہد کی عورت کی واضح تصویر ملتی ہے اس حوالے سے ڈاکٹر زینت بشیر لکھتی ہیں:

''نذیر احمد کے ناولوں میں نسوانی کردار اس عہد کے ہندوستان بالخصوص شمالی ہندوستان کے مسلم گھرانوں کی مستورات کی نفسیات، ان کے خیالات، نظریات ورجحانات کی منہ بولتی تصویریں اور

اس عہد کی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔'' (۳)

نذیر احمد اپنے عہد کی عورتوں میں ایسی صفات دیکھنے کے متمنّی ہیں جن پر گھریلو نظام کی درستی کا انحصار ہے۔ اس وجہ سے وہ تعلیمِ نسواں کے حامی ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق عورتوں کی بہتریں صلاحیتیں تعلیم کے بغیر مکمّل طور پر اُبھر کر سامنے نہیں آسکتیں۔ نذیر احمد خواتین کی آزادی کی بات تو کرتے ہیں مگر وہ مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے اور زندگی کی ڈوڑ میں شامل ہونے والی خواتین کے اختیارات کو محدود کر کے اُن کو گھر کی دہلیز تک محدود کرنے کی بات کرتے ہیں ان کے ناولوں میں خواتین کے کرداروں پر مذہبی چھاپ دیکھائی دیتی ہے وہ عورت کی معاشی آزادی کے اس حد تک قائل ہیں کہ وہ گھر میں بیٹھ کر اپنے ہنر سے اپنی روزی روٹی کما سکیں ان کے نزدیک عورت کا سب سے اہم فریضہ گھریلو ذمہ داری ہے اور وہ عورت کو کھل کر جینے اور سانس لینے کے حامی نہیں دیکھائی دیتے۔ نذیر احمد کے بعد اردو ناول میں جو اہم نام سامنے آتا ہے وہ رتن نارتھ سرشار کا ہے ان کے ناول کرداری ناول ہیں نذیر احمد کی طرح وہ اپنے کرداروں میں عورت کو نیکی اور بدی کا نمائندہ بنا کر پیش کرتے ہیں مگر ان دونوں کے درمیان فرق نصب العین کا ہے نذیر احمد کا مقصد معاشرے کی اصلاح تھا جبکہ رتن نارتھ نے اپنے روزگار کو مدِ نظر رکھا ڈاکٹر عقیلہ جاوید کے بقول'' نذیر احمد اپنی روح کی تسکین چاہتے تھے جبکہ سرشار پیٹ کی'' ان کے ہاں خواتین چاردیواری کی پابند دیکھائی دیتی ہیں اور معاشرے میں رائج رسم ورواج نے ان کی زندگی کو مفلوج کر کے رکھ دیا ہے سرشار نے ان کو ماہر مصور کی طرح اپنی تخلیق میں پینٹ کر دیا ہے ان کے ایسی خواتین سامنے آتی ہیں جو ہر وقت اپنے مردوں پر جان قربان کرنے کے لیے تیار رہتی ہیں اور جو ملک وقوم کو اپنی بہادری سے قائل کرتی ہیں۔ مرزا ہادی رسوا نے ناول کے ارتقاء میں اہم کام کیا جس میں ناول اپنے فنی معیار پر پورے اُترتے دیکھائی دیتے ہیں انہوں نے اپنے ناولوں میں خواتین کو چاردیواری کا پابند نہیں کیا بلکہ وہ ایسے کردار سامنے لاتے ہیں جنہوں نے معاشرے کو بے حد متاثر کیا وہ چادر اور چاردیواری سے باہر دیکھتے ہیں انہوں نے عورتوں کے ایسے کردار تراشے جو لکھنوء کے نوابوں کے لیے عیاشی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ مرزا ہادی کے ناولوں کا مطالعہ کیا جائے تو اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ پسماندہ اور غریب طبقے کی خواتین کو اخلاقی پستی کی جانب دھکیل دیا جاتا ہے جہاں وہ معاشرے کو بربادی کے علاوہ کچھ نہیں دے سکتیں اور وہ جاگیردرانہ دور کی تہذیبی روایات کی امین ہونے پر فخر کرتی ہیں ان کے ہاں مذہب، اخلاق اور شرافت جیسی اقدار بے معنی ہو کر رہ گئی ہیں رسوؔا کو تقدیر کی ماری ہوئی ان خواتین سے بے حد ہمدردی ہے:

> ''رسوؔا: اُمراؤ جان! میری زندگی کا ایک اصول ہے نیک بخت عورت کو میں اپنی ماں بہن کے برابر سمجھتا ہوں۔ خواہ ہو کسی قوم وملت کی کیوں نہ ہو اور ایسی حرکتوں سے مجھے سخت صدمہ پہنچتا ہے جو اس کی پارسائی میں خلل انداز ہوں۔ جو لوگ اس کو ورغلاتے یا بدکار بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ میری رائے میں گولی مار دینے کے ہیں۔ مگر فیاض عورتوں کے فیض سے مستفید ہونی میرے نزدیک کوئی گناہ نہیں۔'' (۴)

ناول کی روایت میں علامہ راشدالخیری کا نام کسی تعرف کامحتاج نہیں انہوں نے اپنے ناولوں میں عورتوں کی توہم پرستی اورضعف الاعتقادی کوکڑی تنقید کا نشانہ بنایا ہےان کے ہاں عورت کوآزادی اظہار جیسے مسائل کا سامنا دیکھائی دیتا ہے وہ عورت کی مغربی تعلیم کی بات تو کرتے ہیں مگراس کومشرقی روایات کا پابند بنانے پربھی تُلے نظر آتے ہیں وہ خواتین کواپنی مرضی کے مطابق ڈھال کرزندگی گزانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ پریم چندجنھوں نے افسانے کو بلندی تک پہنچادیا ان کے ناولوں میں عورت کے جذبات کی ترجمانی ملتی ہے ۔برصغیر میں موجودصدیوں پرانے رواج کوعملی صورت میں توڑنے کا کام کیا اور ایک بیوہ عورت سے شادی کرکے اس رسم پرکاری ضرب لگادی اورعورت کومرد کی طرح دوسری شادی کاحق دار بنادیا جس کی وہ عرصہ دراز سے متلاشی تھی انہوں نے عورت کی مظلومی اور بےبسی کواپنے ناولوں میں نمایاں کیا۔عصمت چغتائی نے اپنے ناولوں میں عورت کوعورت کے روپ میں بیان کیاانہوں نےنوجوان لڑکیوں کےاحساسات وجذبات کےایسےمنطقوں کوطشت ازبام کیا جوکسی مردکےبس کی بات نہیں تھی وہ عورت کی آزادی کے مسائل کی بات کرتی ہیں وہ خودایک متوسط طبقے سےتعلق رکھتی ہیں اورانہوں نے متوسط طبقے کی لڑکیوں کے مسائل کی جانب خاصی توجہ دی اوران کےجنسی مسائل کی جھلک اپنے ناولوں میں پیش کی ان کے ہاں گونگی اوراحساس سےمحروم عورت کا تصوربھی مفقود ہے جوعورت اپنے مرد کی خدمت کرتی ہےاورخاموش رہتی ہےاس کےاندربھی احساسات کا طوفان موجود ہوتا ہے۔عصمت چغتائی کی اس خوبی پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیرآغا کچھ اس انداز میں اظہارِخیال کرتے ہیں:

> ''عصمت چغتائی کے بیشتر کرداروں کے پسِ منظر میں ایک ایسی عورت موجود ہے، جو گھر کی مشین میں محض ایک بے نام سا پرزہ بن کے نہیں رہ گئی بلکہ جس نے اپنے الگ وجود کا اعلان کرتے ہوئے ماحول کی سکہ بندقدروں اوررواجوں کواگرمنہدم نہیں کیا تو کم ازکم لرزہ براندام ضرورکردیا ہے۔''(۵)

ترقی پسندتحریک کی روح رواں ڈاکٹر رشید جہاں کےافسانوں نے نسائی شعور کی ایک نئی راہ ہموار کی۔وہ بلاشبہ اردو کی پہلی افسانہ نگارخاتون تھیں جنھوں نے بڑی جرأت سے معاشرے کےان رخوں کوفنکارانہ انداز میں پیش کیاجنھیں اب تک بوجوہ چھپا کررکھا جاتا تھا۔ڈاکٹر رشید جہاں نے اپنے افسانوں میں ایک انقلابی دل ودماغ رکھنے والی عورت کی تصویرکشی کی ہے۔عورتوں کوڈاکٹر رشید جہاں کےطفیل جب نئی زمین اور نیا آسمان ملاتوان کے تخلیقی جوہربھی کھلنے لگےاورانھوں نے اس حقیقت کو پالیا کہ عورت محض چھوئی موئی نہیں ہے بلکہ اس کے پاس ایک بالغ ذہن اورشعوربھی ہے۔

اردوافسانے میں نسائی شعور کے حوالے سے دومعتبر نام عصمت چغتائی اورقرۃ العین حیدر کے ہیں۔ عصمت نے ایک طرح سےڈاکٹر رشید جہاں کےکام کوآگے بڑھایا ہے۔ایک جگہ خودانھوں نےاعتراف کیا ہے کہ بے باکی،نڈرپن اورصاف گوئی انھوں نے رشید جہاں سےسیکھی ہے۔انھوں نےسوسےزائدافسانے لکھےاوران کا

ہر ناول اور افسانہ نسائی اور طبقاتی شعور کے کسی نہ کسی پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ ''ٹیڑھی لکیر'' اور ''معصومہ'' جیسے ناولوں کے علاوہ ''چوتھی کا جوڑا''، ''گھونگھٹ''، ''امر بیل''، ''لحاف''، ''جنازے''، ''ننھی کی نانی''، ''مٹھی الش'' اور ''بہو بیٹیاں'' ایسے نمائندہ افسانے ہیں جن میں صنفی مسائل اور نفسیاتی الجھنوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جرأت اور بے باکی عصمت کی خاص پہچان ہیں۔ انھوں نے ان موضوعات پر بھی قلم اٹھایا جو پہلے صرف مردوں کے لیے مخصوص تھے۔ ان پر تنقید بھی ہوئی لیکن انھوں نے کسی تنقید کا برا نہیں مانا اور صرف لکھنے پر توجہ مرکوز رکھی۔

عصمت کے بعد موضوعات کے تنوع اور انفرادیت کے لحاظ سے ایک بہت بڑا نام قرۃ العین حیدر کا ہے جن کا ذہنی کینوس اپنے پیشرو مردوں اور عورتوں سے کہیں زیادہ وسیع تھا۔ سماجی، تہذیبی اور نسائی شعور کا ادراک جیسا ان کے ہاں نظر آتا ہے ان سے پہلے یا بعد میں کہیں نہیں ملتا۔ ان کا انداز، طرزِ تحریر اور قوتِ مشاہدہ کا استعمال انہی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ افسانوں اور ناولوں میں تاریخی حوالے پوری دیانت کے ساتھ استعمال کرنا انہی کا حصہ تھا۔ تخیل اور حقیقت کا یہ ادراک انھیں ورثے میں ملا تھا جسے انھوں نے اپنے وسیع مطالعے اور فکر کی گہرائی سے مزید جلا بخشی۔ ''گردشِ رنگِ چمن'' کی دو مغل شہزادیاں جنھیں حالات اربابِ نشاط بنا دیتے ہیں۔ ڈاکٹر عنبرین اور اس کی نہایت حسین ماں عندلیب وقت اور اپنوں کے ہاتھوں کس طرح برباد ہوتی ہیں۔ ان کا ماضی ہر جگہ ان کا پیچھا کرتا ہے۔ ''اگلے جنم موہے بیٹا نہ کیجو'' کی قمرن اور جمیلن ''سیتا ہرن'' کی مایا ''دلربا'' کے نسوانی کردار ''دلربا اور ''گلنار'' کے علاوہ ان کے افسانے ''فوٹو گرافر'' کی اداکارہ ''نظارہ درمیاں ہے'' کی پیرو و جادستور۔ اکثر اس طرح سے بھی رقص فغاں ہوتا ہے'' کی جمال آرا ''پت جھڑ کی آواز'' کی تنویر فاطمہ ''حسب نسب'' کی چھمی بیگم ''سنگھاردان'' کی زمرد پری اپنے اپنے نسائی وجود میں کن کن المیوں سے گزرتی ہیں اور ''تار پر چلنے والی'' کی ہیروئن کیتھرین وڈ پال سرکس کی مس لارا کیسے بنی۔ ''روشنی کی رفتار'' کی سائنٹسٹ مس پدما میری اپنی تمام تر قابلیت کے باوجود دھوکا کیوں کھا گئی؟ زندگی کی حرارت سے بھرپور عورت ٹوٹ کر بکھر کیوں گئی؟ قرۃ العین حیدر نے ان کی اندرونی کیفیات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری ان کرداروں کا دکھ اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔

عزیز احمد کے ہاں بنیادی خیال عورت اور اس کی جنسی کشش ہے اور جہاں ان دو عناصر کی کارفرمائی ہو گی وہاں تلذذ کا پہلو نمایاں ہو گا ان کے ہاں عورت اپنے محدود دائرے میں رہ کر مرد کے شباب کو ایندھن فراہم کرتی ہے مرد عورت کے حسن سے نہیں بلکہ اس کی جنسیت سے متاثر ہوتا ہے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر دوبارہ پلٹ کر یہ نہیں دیکھتا کہ اس کی چند روزہ عیاشی نے عورت کی زندگی کو کتنا اجیرن بنا دیا ہے اور گناہ کا احساس نہ اسے جینے دیتا ہے اور نہ مرنے۔ ضمیر صرف عورت کو تنگ کرتا ہے۔ عورت صرف مرد کے جذبات کے شعلے کو مشتعل کرنے کے کام آتی ہے۔ مرد کو صرف عورت چاہیے جس سے وہ ہم کنار ہو سکے ان کے ہاں جہاں زیادہ بھوک اور فراغت ہو وہاں بدکاری آسانی سے پنپتی ہے۔

عزیز احمد کے ہاں عورت کو صرف جنس کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور اس کے آزادی اظہار کو جنسی

خواہشات کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور کسی کام میں اس کی قابلیت نہیں دیکھی جاتی۔ قرۃ العین حیدر ایک روشن خیال گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں اور ان کے ہاں عورت ہمیں حقیقت سے بعید دیکھائی نہیں دیتی کیوں کہ ان کے ناولوں میں ان کے اپنے ماحول کی عورت ہے جو اپنے آدرش، جذبات، خواہشات اور تمناؤں سمیت فنی تقاضوں کے زیرِ اثر اپنے ارتقائی عمل سے گزر کر جب قاری کے سامنے آتی ہے تو دھند میں لپٹی ہوئی نہیں بلکہ مزید چمک دار رنگوں سے آراستہ ہوتی ہے۔ جس تہذیب سے وہ عورت کے کردار کو کشید کرتی ہیں وہاں عورتیں اپنی بچیوں کو اعلیٰ تعلیم دلواتی ہیں جس کی بدولت وہ مردوں اور نوکروں پر حکمرانی کرتی ہو دیکھائی دیتی ہیں اور آزادی اظہار جیسی نعمت کو بروِکار لاتے ہوئے زندگی بسر کرتی ہیں۔ شوکت صدیقی عورت کے بارے میں بیشتر ترقی پسندوں کی طرح ایک خاص تصور رکھتے ہیں۔ وہ عورت کو دوہرے استحصال کا شکار سمجھتے ہیں ایک طرف عورت رسم ورواج توہم پرستی کی وجہ سے استحصال کا شکار ہوئی جب کہ دوسری طرف مرد کی سماجھی برتری کے باعث۔

شوکت صدیقی کے ہاں معاشرے کی سچی تصویریں اُن کی معاشرے سے گہری وابستگی کا ثبوت فراہم کرتی ہیں جس میں اقتصادی معاشی اور ذہنی استحصال کے ساتھ ساتھ جنسی استحصال کی مکروہ اور گندی تصویراُ بھرتی ہے جہاں نو جوان لڑکی کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے لیے اس کی ماں سے شادی کر کے اس کو زہر کے انجیکشن لگوا کر اُس کی جان لی جاتی ہے۔ ان کے ہاں عورت دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر عقل وخرد کو خیر باد کہہ کر بڑے سے بڑا اقدم اُٹھا سکتی ہے وہ چاہے تو اُس کی مرضی کے بغیر اس کو کوئی مرد ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ شوکت صدیقی کے ہاں عورت کوئی تخیل کی تصویر نہیں بلکہ ہمارے معاشرے کی سچی کہانی ہے جو مرد کی خلوت کا کھلونا ہے جو مجبور معاشرے کی نشانی ہے ان کے ہاں عورت کو آزادی اظہار جیسی سہولت کو مجبوری سے نوازا گیا ہے جن کی ڈور اپنے سماج کے جاگیرداروں کے ہاتھ ہے۔

ڈاکٹر احسن فاروقی کے ناولوں میں عورتوں کی تین اقسام اپنی سرگرمیوں سمیت سامنے آتی ہیں ایک قسم نوابین کی بیویوں، بیٹیوں اور بہوؤں کی ہے۔ دوسری قسم متوسط شریف گھرانوں کی خواتین اور تیسری قسم لونڈیوں یا رنڈیوں کی ہے۔ پہلی قسم کی عورتوں میں امیرزادیاں شامل ہیں جن کی خواہشات کا خیال رکھا جاتا ہے ان کی ضروریات زندگی ہر ممکن صورت میں پوری کی جاتیں ہیں مگر یہ خواتیں چاردیواری کے اندر ہی رہ کر زندگی گزارتی ہیں۔ دوسری قسم کی خواتین متوسط گھرانے کی ہیں یہ زندگی کی دوڑ میں اپنے آپ کو شامل کرنے کے لیے اپنی عزت تک کا سودا کر جاتی ہیں ظاہری ٹھاٹھ باٹھ کی خواہش ان کو مزید پستی میں دھکیل دیتی ہے اور معاشرے میں اپنی ناک کٹوا لیتی ہیں۔ تیسری قسم رنڈیوں اور لونڈیوں پر مشتمل ہے جو سارے سماج پر حاوی دیکھائی دیتی ہیں اگر دیکھا جائے تو یہ گروہ کہیں تو سہولت کار کا کام کرتی ہیں اور کہیں یہ معاشرے کا اصل چہرہ سامنے لاتی ہیں یہ ظاہری ٹھاٹھ باٹھ کے علاوہ جنسی تسکین کا باعث ہوتی ہیں دولت کو بنیاد بنا کر ان کا استحسال کیا جاتا ہے اور یہ معاشرے کو سستی تفریح کا سامان مہیا کرتی ہیں۔

احسن فاروقی کے ہاں عورت کا حقیقی روپ خاص اثر پیدا کرتا ہے بیگمات کے کردار میں زیادہ تر اپنے تخیل

کی بات کرتے ہیں جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ان کے ہاں مائیں اور کنیزیں زیادہ فعال دیکھائی دیتی ہیں۔ ممتاز مفتی کے ہاں عورت کے کردار کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عورت مخصوص نسوانی ساخت اور اس کی مخصوص ذمہ داریاں اور انتہائی آزاد ہونے کے باوجود اس کے وجود کے اندر جاری وساری عزتِ نفس کی بحالی کی جنگ عورت کو آوارگی کے بعد راندہ یا زندہ درگور کر کے دم لیتی ہے ان کے ہاں معاشرے کا تضاد کھل کر سامنے آتا ہے اگر کوئی لڑکی کسی لڑکے کے ساتھ بھاگ جاتی ہے تو اس کی جان لے لی جاتی ہے اگر بچ جائے تو ساری زندگی اس کو اس کام کی بدولت ذلیل ورسوا کیا جاتا ہے اور اس لڑکے کو تحفظ فراہم کیا جاتا ہے جو اس لڑکی کو بھگا کر لے جاتا ہے۔ ان کے ہاں عورت نامساعد حالات کا شکار ہو کر جسمانی اور ذہنی مسائل کا شکار ہو کر اپنے انجام کو المیہ بنا کر پیش کرتی نظر آتی ہے جس سے معاشرے کا اصل چہرہ دیکھائی دیتا ہے۔ خدیجہ مستور کے ہاں اگر عورت کی آزادی کی بات کی جائے تو انہوں نے متحدہ ہندوستان کے زوال آمیز اور چھوٹے زمینداروں کے سماج سے تعلق رکھنے والی عورت کے مسائل کو نمایاں طور پر پیش کیا ہے جہاں تعلیم تو ہے مگر آکسفورڈ اور کیمرج کی تعلیم نہیں جہاں فیشن پرستی کلبوں، سینما ہالوں کی گہما گہمی نہیں۔ جہاں شیکسپئر، ورڈز ورتھ، مارکس اور ہیگل کے موضوعات نہیں یہاں تو صرف ماضی کی خوشگوار یادیں، حال کی تلخیاں مستقبل کی محرومیاں، زندگی کی گھٹن۔ بے بسی اور لاچاری نظر آتی ہے جس کے پیچھے ماحول، مذہب اور رسم ورواج کارفرما دیکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی کے مطابق:

> ''ماحول کی جکڑ بندیاں سم اور تہمینہ دونوں سے خودکشی کراتی ہیں۔ ہندومت یا اماں کی ہٹ ماحول کے رجحان ہیں۔ جن کے سامنے دونوں حسین لڑکیاں بے بس ہیں اور مکمل طور پر پسپا ہو کر رہتی ہیں۔''(۲)

نثار عزیز بٹ کے ناولوں میں عورت اذیت سے نہیں ڈرتی بلکہ زندگی کے جمود سے وحشت زدہ ہے۔ کیوں کہ زندگی جیئے جانے کے قابل تبھی ہوتی ہے جب اس میں تحریک ہو اور ہو جمود کا شکار نہ ہو۔ ان کے ہاں عورت شمال مغربی سرحدی صوبے کی تاریخ اور تہذیب وتمدن میں سانس لیتی ہے۔ پشتون عورت جب پیدا ہوتی ہے تو اس کی ولادت کو اچھا نہیں سمجھا جاتا پھر اس کی پرورش اور تعلیم وتربیت پر کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی جب وہ کام کاج کے قابل ہو جاتی ہے تو اس کو گھر کے کام کاج میں لگا دیا جاتا ہے اور جب جوان ہوتی ہوئی دیکھائی دیتی ہے تو اس کے وارث اس کو اپنی مرضی سے بیچ دیتے ہیں اور اس کے جہیز کے پیسے اس کے شوہر سے لیے جاتے ہیں اور اس معاشرے میں اس کو ساری زندگی دوسروں کے تابع گزارنی پڑتی ہے اور زندگی کے امور میں اس کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی اور اس کو امورِ خانہ داری میں شب وروز کی محنت صرف کرنی پڑتی ہے اس کے ارمانوں کا خون اور استحصال کیا جاتا ہے۔

انتظار حسین اردو فکشن میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں ان کے ہاں عورت سماجی اعتقادات کو ساتھ لے کر

چلتی ہے۔ نا مساعد حالات کا شکار عورت، ضعف الاعتقادی کا شکار ہو جاتی ہے اور ان پڑھ ہونے کی صورت میں دقیانوسی بھی ہو جاتی ہے ان کے ہاں جو خواتین پائی جاتی ہیں وہ اکثر شرفاء گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں جو اپنے مردوں سے یا نوکرانیوں سے ادھر اُدھر کی سن کر اپنی محبوب معلومات سے دوسروں کو مستفیض یا ہراساں کرتی ہیں اور پھر یہی خیالات انہیں ڈراؤنے خوابوں کی صورت میں دکھائی دیتے ہیں جس کے نتیجے میں درگاہوں پر چراغ روشن کیے جاتے ہیں اور گھروں میں محافل کا انعقاد کیا جاتا ہے جہاں خواتین ایک بار پھر اکٹھی ہو کر طرح طرح کی افواہیں پھیلا دیتی ہیں اس معاشرے میں عیب جوئی بہترین مشغلے کے طور پر سامنے آتی ہے یہیں بھی آزادی اظہار کا فقدان دیکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر عقیلہ جاوید کے مطابق:

> ''انتظار حسین کے ناولوں میں عورت کا روپ محض جلی کٹی سنانے والی کا ہی نہیں بلکہ ایسی شخصیت کے روپ میں سامنے آتا ہے جو سادہ، اداس اور خاموش ہے جس کی وجہ اس کا اپنے ماحول سے عدم اعتماد اور بیگانگی کا رشتہ ہے۔'' (۷)

وہ زمانہ گزر گیا جب خواتین مختلف مسائل کا شکار تھی اور نسائی مشکلات اُن کا معاشرتی استحصال اور اُنھیں مرد سے کم تر سمجھنے کا رویہ ساری دنیا کی خواتین کے دلوں اور ذہنوں میں لاوے کی طرح مقید تھا، لیکن یہ لاوا مغرب میں پھٹا جس کی آگ نے نسائی تحریک کی شکل اختیار کی اور وہ دنیا بھر میں پھیل گیا۔ اس کا سہرا ادب کے علاوہ غیر رضا کار تنظیموں اور میڈیا کے سر بھی باندھنا چاہیے، جنھوں نے اپنی نظموں، افسانوں، ناولوں، ڈراموں اور گروہی مباحثوں کے ذریعے معاشرے میں عورت کی حالتِ زار کو پیش کیا اور پھر یہ دانشورانہ سطح پر عالمی معاشرے کے مباحثوں اور تحریروں کا جلی عنوان بن گیا اب عورت اتنا حوصلہ رکھتی ہے کہ وہ اپنے ساتھ ہونے والی انفرادی اور اجتماعی ناانصافیوں کے خلاف آواز بلند کر سکے جس کے لیے تحریر، تقریر، تمثیل اور تنظیم کے راستے کھلتے چلے جا رہے ہیں۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ عورت نے اپنے آپ کو پہچان لیا ہے اور اپنی شناخت کو باوقار بنانے میں کامیاب ہو گئی ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ ابنِ حنیف، ہزاروں سال پہلے، مکتبہ کارواں، لاہور، ۱۹۶۰ء، ص: ۱۲

۲۔ روسو، ژاں ژاک، معائدہ عمران، مترجم، ڈاکٹر محمود حسین، بک ہوم، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۴۱

۳۔ زینت بشیر، ڈاکٹر، نذیر احمد کے ناولولوں میں نسوانی کردار، الیاس ٹریڈرس، حیدر آباد، ۱۹۹۱ء، ص ۱

۴۔ محمد ہادی، رسوا مرزا، اُمراؤ جان ادا، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص ۲۴۰

۵۔ وزیر آغا، ساختیات اور سائنس، مکتبہ فکر و خیال، لاہور ۱۹۹۱ء ص ۷۱

۶۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر ''آنگن پر دوسری نظر'' فنون، لاہور، مئی جون ۱۹۶۵ء جلد۔ ا شمارہ ا۔۲

۷۔ عقیلہ جاوید، ڈاکٹر ''اردو ناول میں تانیثیت'' شعبہ اردو بہاؤالدین یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۰۵ء ص ۲۱۹

مآخذ:

۱۔ ابن حنیف، ہزاروں سال پہلے، لاہور، مکتبہ کارواں، ۱۹۶۰ء۔

۲۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر، آنگن پر دوسری نظر، مشمولہ، فنون، جلد ا شمارہ ۱۔۲۔ لاہور۔ مئی جون ۱۹۶۵ء۔

۳۔ روسو، ژاں ژاک، معاہدہ عمرانی، مترجم، محمود حسین، ڈاکٹر، لاہور، بک ہوم، ۲۰۰۳ء۔

۴۔ زینت بشیر، ڈاکٹر، نذیر احمد کے ناولوں میں نسوانی کردار، حیدرآباد، الیاس ٹریڈرز، ۱۹۹۱ء۔

۵۔ عقیلہ جاوید ڈاکٹر، اردو ناول میں تانیثیت، ملتان، شعبہ اردو، بہاؤالدین یونیورسٹی، ۲۰۰۵ء۔

۶۔ محمد ہادی، رسوا مرزا، امراؤ جان ادا، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۱ء۔

۷۔ وزیر آغا، ساختیات اور سائنس، لاہور، مکتبہ فکر و خیال، ۱۹۹۱ء۔